رسائل و مسائل

خطبۂ جمعہ کی زبان

نظام آباد سے ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

خطبۂ جمعہ کی زبان کے مسئلہ پر جناب نے جو نقلاً و عقلاً روشنی ڈالی ہے اور حالات زمانہ کے لحاظ سے جو نتائج اخذ فرمائے ہیں اس حد تک تو مجال اختلاف نہیں۔ سچ ہے کہ عربی زبان تو درکنار مسلمان اپنی ابتدائی دینی تعلیم بھی لازمی نہیں کرا سکتے تو خطبۂ عربیہ کا حکم کیا معنی مجبور کے لیے تو حرام کھانے کی بھی اجازت ہے لیکن اس تحقیق میں جناب نے جو اصولی بحث چھیڑ دی ہے وہ محل نظر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے عمل کو مصلحت شرعی کے بجائے ایک طبعی فعل قرار دینے پر جو دلائل اور وجوہ جناب نے تحریر فرمائے ہیں وہ قلب کو مطمئن نہیں کرتے۔ بلاشبہ اسلام کو وطنی اور لسانی عصبیت سے کوئی علاقہ نہیں بلکہ وہ آیا ہی اس لیے ہے کہ گروہ انسانی میں ملکی و نسلی اور لسانی جو غلط تخیلات بناء تفریق و تقسیم ہیں ان کو مٹا کر مختلف اقوام کی جگہ ایک قومیت کی تعمیر کی جائے۔ اس قومیت کا نام اسلام ہے۔ اِنَّ الدِّینَ عِندَ اللّٰہِ الاِسلَام (۳ : ۲) اور قوم کا نام مسلم رکھا گیا ہُوَ سَمّٰکُمُ المُسلِمِینَ (۲۲ - ۱۰) جس طرح دنیا میں مختلف قومیں آباد ہوئیں اور ہیں اور ہر قوم کی ایک زبان رہی ہے تو فطرۃً اس قوم "مسلم" کی بھی کوئی ایک زبان ہونی چاہیے۔ جو نتائج فطرۃً و لازماً پیدا ہوتے ہیں ان کو حاصل کرنے کا حکم نہیں دیا جاتا حکیم یہ نہیں کہیگا کہ تم مرض کو دفع کرو بلکہ ان ہدایتوں پر عمل کرائیگا جن پر عمل کرنے کا نتیجہ صحت ہے۔ حاکم قوم محکوم کی زبان کو بدلدینے کا حکم نہیں دیتی۔ فطرۃً محکوم حاکم قوم کی زبان اختیار کرینگے۔ پھر خالقِ فطرت ایسا حکم کیوں دیتا اور خالقِ فطرت کا رسول ایسی ہدایت

کیوں دے جس کا ظہور بطور نتیجہ لازمی ہوتا۔ نزول قرآن کا مقصد یہی ہے کہ گروہ انسانی میں حکومت الٰہیہ قائم کی جائے حکومت کی زبان عربی ہے حکومت کے کاروبار انجام دینے والوں کی زبان اس کے محکوم کی زبان لازماً وہی ہوگی۔ قرآن عربی ہونے کے متعلق جو آیتیں ہیں وہ ملاحظہ ہوں:۔

اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۔ (۱۲:۲) — ہم نے اس قرآن کو عربی میں اتارا ہے تا کہ تم بخوبی سمجھ سکو

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ۔ (۱۹:۶) — ہم نے اس قرآن کو تیری زبان میں آسان کر دیا تاکہ تو اس کے ذریعہ سے پرہیز گاروں کو بشارت دے اور اکھڑ لوگوں کو عذاب سے ڈرائے

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا الخ (۲۰:۶) — اور اس طرح ہم نے اس کو عربی زبان کا قرآن اتارا ہے۔

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِىْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (۳۹:۲) — قرآن عربی جس میں کوئی پیچیدگی نہیں تا کہ لوگ سمجھ کر خدا سے ڈریں

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۔ (۴۱:۱) — قرآن عربی ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔

اگر ان آیتوں کا صرف یہ مطلب ہے کہ رسول اللہ عرب تھے دعوت اسلام ابتداءً اہل عرب کو دی گئی اس لیے قرآن عربی زبان میں نازل ہوا تو یہ ایسی کیا "حکمت" کی بات تھی جو ایک "حکیم" نے بتائی یہ نہ بھی بتایا جاتا تو بھی یہی سمجھا جاتا۔ قرآن اور رسول اللہ اہل عرب ہی کے لیے نہیں تھے تو پھر یہ کوئی قرینہ نہیں کہ ان آیتوں کے مخاطب تو اہل عرب تھے اور باقی آیتوں کے مخاطب تمام بنی آدم۔ اگر قرآن اپنے مخاطب کی زبان کے لحاظ سے عربی میں نازل ہوا ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ اکثر احکام بھی اہل عرب کے طبعی وملکی حالات کے لحاظ سے نازل ہوئے۔ جیسا کہ بعض کج فہم کہتے ہیں۔ وہ قرآن جو..... تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ اور مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ہے۔ جو هُدًى لِّلنَّاسِ و ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ہے، کل بنی آدم کے لیے جس کو صراط مستقیم کہا جا رہا ہے پھر وہ بنی آدم جن میں بیسیوں زبانیں بولی جاتی ہیں ان سب کے لیے قرآن عربی نازل کرنے میں کیا "حکمت" نہاں ہے۔ وہ خدا جو اپنے رسول کو رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ اور رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ کا مرتبہ دیکر "معلم کتاب و حکمت" بنا کر تمام بنی آدم

کی ہدایت کے لیے بھیجا ہے کیا اس پر قادر نہ تھا کہ ایسے عظیم المرتبت رسول کو کل زبانوں سے واقف کردے؟
اگر احکم الحاکمین کا یہ مقصد نہ تھا کہ اس کا دین ایک ہی زبان جاننے والوں کا دین ہو کر رہ جائے؟

نبی کریم کا عربی زبان میں خطبہ دینا کسی شرعی مصلحت کا حامل نہیں تو غیر عربی زبان جاننے والوں کے لیے قرآن عربی نازل کرنا اور اس کی اشاعت کے لیے صرف عربی زبان جاننے والوں کو منتخب کرنا کیا نزول قرآن کے مقصد کو فوت نہیں کرتا؟ بلاشبہ رسول عربی کے مخاطب اہل عرب تھے مجلس نبوی کے حاضرین میں غیر زبان جاننے والوں کی تعداد کم رہتی تھی مگر نبی کریم نے جو دعوت نامے قیصر روم و شاہ ایران کو بھیجے تھے وہ کیوں عربی زبان میں بھیجے گئے؟ اگر مصلحت شرعی یہ نہیں ہے کہ دین کی اشاعت ایک ہی زبان میں ہو تو نبی کریم نے اس کو کیوں ملحوظ نہیں رکھا؟ "معلم کتاب و حکمت" کا کوئی فعل جس کا تعلق رسالت سے ہو خالی از حکمت نہ ہونا چاہیے۔ تمام دنیا کے لیے قرآن عربی نازل کرنا اسی حکمت کو ظاہر کرتا ہے کہ اس دین سے جو قوم پیدا ہو گی اس کے افراد ایک ہی زبان بولنے والے ہوں۔ یہ بناء تفریق نہیں نتیجۂ وحدت ہے۔ خلاف فطرت نہیں عین فطرت ہے۔ دین الٰہی قائم ہوگا تو یہ مقصد خود بخود پورا ہو جائے گا۔ کسی قوم کو بھی لیجیے! افراد قوم کی ایک ہی زبان ہو گی! آج ہندوستان میں جہاں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں ہندوستانی قومیت کی تعمیر کے لیے وحدت زبان کی گتھی سلجھائی جا رہی ہے۔ دین اسلام اپنے متبعین میں رشتۂ اخوت قائم کرتا ہے۔ زبان کے اختلاف سے اجنبیت باقی رہے گی جو منافی اخوت ہے۔ ایک انگریز ایک ہندی ایک عرب ایک ترک ایک جاپانی ایک چینی یہ چھ مسلمان ایک جگہ جمع ہیں۔ آپس میں تبادلۂ خیالات تو کجا اسلامی طریقے سے سلام بھی نہیں کر سکتے۔

ایک مقام پر آپ یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اصلی اسلامی اسپرٹ کا تحفظ خالص عربیت کے تحفظ پر موقوف تھا۔ اس کے بعد یہ ارشاد کہ سیدنا عمر و سیدنا علی رضی اللہ عنہما میں اسی اسلامی اسپرٹ نے عربیت کا تعصب اور بھی زیادہ پیدا کر دیا۔ مولانا! غور مکرر کا محتاج ہے۔ وہ لوگ جن کی مثال دنیا میں

اسلام آج تک نہ پیش کرسکی جو نور وہدایت علم وعمل سے آراستہ ہوکر عصبیۃ جاہلیت کو مٹانے کے لیے اٹھے تھے ان میں اسلام نے وہی عصبیت پیدا کردی! حیرت کا مقام ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اصلی اسلامی اسپرٹ کا تحفظ خالص عربیت کے تحفظ پر موقوف تھا اس لیے عربیت کا تعصب نہیں بلکہ اسلام کی عصبیت عربی زبان کے تحفظ کی متقاضی تھی ورنہ جو استدلال جناب نے فرمایا ہے وہ تسلیم کرلیا جائے توجہاد اسلامی کے متعلق یہ..... اعتراض کس قدر وزنی ہوجائے گا کہ چونکہ عرب پہلے سے قتل و غارت گری کے عادی تھے اسلام نے اس جذبہ کو اور ابھار دیا۔ گویا ان مقدس ہستیوں سے جو جان نثاریاں ہوئیں وہ دینی جذبہ نہیں تھا بلکہ ان کا عادی وطبعی فعل تھا۔ جس طرح عادی وطبعی فعل اور شرعی عمل کا امتیاز مشکل ہے اس سے زیادہ اس فعل کا تعین مشکل ہے جو عادی وطبعی بھی ہو اور مصلحت شرعی کا تقاضا بھی۔

صحابۂ کرام یا ائمۂ سلف نے اگر غیرعربی زبان میں خطبہ نہیں دیا یا عجمیوں کو دعوت اسلام نہیں دی یا غیرعربی زبان میں بات کرنا بھی مکروہ سمجھتے تھے تو وہ عادی وطبعی فعل یا حالات زمانی کا نتیجہ نہیں تھا۔ بلکہ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ کا نتیجہ تھا۔ دین الٰہی ان کے رگ و پے میں جاری وساری تھا۔ ان کی روح ان کے دل و دماغ احکام الٰہی کے تابع تھے۔ وہ حکومت الٰہیہ کے سچے محکوم تھے جس طرح یہ حکومت ان کو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ محبوب تھی اسی طرح حکومت کی زبان (جو عربوں کی نہیں بلکہ خدا کی حکومت تھی) اُن کو دوسری زبانوں سے زیادہ عزیز تھی۔ کہ یہی انسانی فطرت ہے۔ آج جو لوگ حکومت کے شیدائی ہیں فرنگیت میں جذب ہوگئے ہیں ان کا اوڑھنا بچھونا انگریزی زبان ہے حالانکہ ملک معظم نے یا وائسرائے بہادر نے ان کو اپنی زبان بدل دینے کا کوئی حکم نہیں دیا۔

عصبیت لسانی کو مٹانے کا منشا، یہ ہے کہ عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اسلام سے پہلے بھی جنہیں

یہاں امتیاز تھی عجمی مسلمان ہونے کے بعد اسی طرح صاحب عزت و توقیر ہیں جیسے عرب اگر وہ عربی سے واقف نہیں تو ان کو کم تر نہ جانو۔ اسلامی قومیت میں جذب اور دین الٰہی میں شامل ہو جانے کے بعد ان کی زبان لازماً وہی ہو جائے گی جو حکومت کی زبان ہے کہ قوم مسلم در اصل حکومت الٰہی کی محکوم ہے۔

جس قوم کے ایمانیات و اعتقادات ایک جس کا مقصد حیات ایک جسکی زندگی کا نصب العین ایک ہو جسکی تعلیمات اخلاقیات معاملات عادات میں یکسانیت ہو اس قوم کی زبان ایک نہ ہونا دین کا مقصد نہیں! تعجب ہے! جس طرح اسلام سے پہلے کعبہ صرف عربوں کا تھا اسلام کے بعد وہ ہر مسلم کا کعبہ ہو گیا۔ اسی طرح اسلام سے پہلے عربی زبان صرف عربوں کی زبان تھی۔ اسلام کے بعد وہ زبان صرف عربوں کی نہیں رہی بلکہ قوم مسلم کی زبان ہے۔

ترجمان القرآن۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مراسلہ نگار نے مسئلہ زیر بحث پر اصولی طریقے سے غور نہیں کیا ہے، اسی وجہ سے ان کے کلام میں مختلف مباحث ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط ہو گئے ہیں۔ مسئلہ کا ایک پہلو فقہی ہے اور اس نقطۂ نظر سے صرف یہ امر بحث طلب ہے کہ آیا خطبہ کو عربی زبان میں پڑھنا شرعاً ضروری ہے یا نہیں؟ اس سوال کے متعلق کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے لیے حسب ذیل امور کی تحقیق ہونی چاہیے: کیا خطبۂ عربیہ کے وجوب پر کوئی نص ہے؟ اگر نص نہیں ہے اور یہ حکم صرف شارع کے عمل سے ماخوذ ہے تو کیا شارع کا یہ عمل سنت کی تعریف میں آتا ہے؟ آیا اصطلاح شرع میں سنت ہر اس عمل کو کہتے ہیں جو شارع نے کیا ہو، یا اس باب میں شرعی عمل اور عادی و طبعی عمل میں کوئی فرق کیا گیا ہے؟ اگر فرق ہے تو شارع کا عربی میں خطبہ دینا کس قسم کا فعل ہے، شرعی یا طبعی؟ مسئلہ کا دوسرا پہلو مصالح سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کے لیے حسب ذیل امور کا تصفیہ ضروری ہے:۔ خطبہ کا مقصد کیا ہے؟ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے شارع نے اور صدر اول کے

ائمہ نے جو طریق اختیار کیا تھا اس کی پابندی سے آج بھی وہ مقصد حاصل ہوتا ہے یا نہیں؟ اصول شریعت میں مقصد زیادہ اہمیت رکھتا ہے یا وہ وسیلہ جو اس کو حاصل کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہو؟ اگر مقصد زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور کسی خاص صورت حال میں طریقۂ متوارثہ کی پابندی سے وہ فوت ہو رہا ہے اور اس صورت حال کو بدلنے پر ہم قادر نہیں ہیں تو کیا ہم اصول شرع کے تحت طریقۂ متوارثہ میں کوئی تغیر کر سکتے ہیں؟ اگر تغیر کرنے کا حق ہم کو حاصل ہے تو حالات کے لحاظ سے ہمیں کتنا اور کس طرح تغیر کرنا چاہیے؟ یہ ہیں وہ تنقیحات جن کے تصفیہ پر زبان خطبہ کے سوال کا حل منحصر ہے۔ اگر مراسلہ نگار نے ان تنقیحات کو پیش نظر رکھ کر بحث کی ہوتی تو ہم کو یہ معلوم کرنے میں آسانی ہوتی کہ انہیں کن امور میں ہم سے اتفاق ہے اور کن امور میں اختلاف؟ پھر جو امور مختلف فیہ باقی رہ جاتے ان پر مزید بحث کر کے صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ لیکن جو طریق بحث انہوں نے اختیار کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل امور تنقیح طلب ان کے سامنے واضح نہیں ہیں بلکہ وہ محض چند ضمنی مباحث میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ بہر حال چونکہ وہ خطبہ کے مسئلہ میں مانعین تغیر کے عام خیالات کی ترجمانی کر رہے ہیں، اس لیے ہم ان کے مضمون کو شائع کر کے اختصار کے ساتھ ان غلط فہمیوں کو رفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کی وجہ سے ان کو اور اسی طرز خیال کے دوسرے لوگوں کو اس مسئلہ میں الجھن پیش آتی ہے۔

صاحب مضمون نے زبان کے متعلق جو طریق استدلال اختیار کیا ہے وہ قریب قریب وہی طریق استدلال ہے جس کی بنا پر ایک گروہ اس سے پہلے قرآن مجید کا ترجمہ دوسری زبانوں میں کرنے کی مخالفت کر چکا ہے اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر ان مقدمات کو تسلیم کر لیا جائے تو قرآن کا ترجمہ کرنا بھی اسی طرح ناجائز قرار پائے گا جس طرح غیر عربی میں خطبہ دینا ناجائز قرار دیا جاتا ہے۔ آپ کہہ دیجیے کہ عربی زبان اسلام کی سرکاری زبان ہے، جو لوگ اسلام کے محکوم ہیں ان پر اس زبان سے واقف ہونا لازم ہے، اور اگر وہ عربی سے واقفیت پیدا نہیں کرتے تو یہ ان کا قصور ہے۔

لہٰذا ان کو سمجھانے کے لیے قرآن کے مطالب کو ان کی مادری زبان، یا بالفاظ دیگر کسی "غیر سرکاری" زبان میں بیان نہیں کیا جائیگا۔ اسی طریقے سے آپ یہ بھی کہہ دیجیے کہ ان کے سامنے اسلامی احکام، اسلامی عقائد، اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور دوسری "سرکاری" چیزوں کو بھی صرف سرکاری زبان ہی میں بیان کیا جائیگا۔ کوئی چیز غیر سرکاری زبان میں نہ بیان ہوگی خواہ وعظ کی صورت میں ہو یا تحریر کی صورت میں۔

فرمائیے! اگر کوئی شخص یہ پوزیشن اختیار کرے تو کیا آپ اس کو قبول کریں گے؟ غالباً نہیں۔ اس لیے کہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ موجودہ حالات میں ایسا کرنے سے مسلمانوں کی تقریباً ۸۰ فی صدی آبادی اسلام کے علم سے بالکل بے بہرہ ہو جائیگی۔ اسی بنا پر آپ قرآن حکیم کے ترجمے دوسری زبانوں میں کرنے کو نہ صرف جائز بلکہ ضروری سمجھتے ہیں، اور اسی بنا پر آپ غیر سرکاری زبان میں سرکاری مضامین کی اشاعت کو مواعظ اور تحریروں کی شکل میں نہ صرف گوارا بلکہ پسند کرتے ہیں۔ جب حال یہ ہے تو آخر کیا وجہ ہے کہ یہ تمام بحثیں صرف خطبۂ جمعہ کے مسئلہ میں پیدا ہوتی ہیں؟ مسجد میں اگر کوئی شخص نماز کے بعد یا خطبہ سے پہلے عجمی زبان میں وعظ کہے تو جائز بلکہ مفید اور انہی مضامین کو اگر وہی شخص منبر کی دو سیڑھیوں پر چڑھ کر خطبۂ جمعہ کی حیثیت سے بیان کرنے لگے تو ناجائز بلکہ بدعت! یہ کھلی ہوئی ناہمواری جو آپ کے طرز عمل میں پائی جاتی ہے، اس کو شریعت کی طرف منسوب کرنے سے پہلے اپنے نفس کو ٹٹول کر دیکھیے کہ وہاں کوئی غیر شرعی محرک تو چھپا ہوا نہیں ہے؟ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ عادتِ قدیمہ کی محبت میں مبتلا ہوتے ہیں، اور جب کوئی مجتہد، حالات کے تغیر اور زمانہ کی بدلی ہوئی ضروریات کو محسوس کر کے طریقۂ متوارثہ میں ترمیم کی جرأت کرتا ہے تو وہ محض اس بنا پر اس کی مخالفت کرنے لگتے ہیں کہ اس نے ایک ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جس سے ان کے طبائع مانوس نہیں ہیں، مگر جب یہ نیا طریقہ چل پڑتا ہے اور اجنبیت دور ہو جاتی ہے تو لوگ اس کو نہ صرف جائز بلکہ مفید سمجھنے لگتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب

نے جب قرآن مجید کا ترجمہ فارسی میں کیا تو اسی بنا پر ان کی مخالفت کی گئی تھی۔ اُن سے پہلے ایک دور
ایسا بھی گذرا ہے جس میں عربی زبان کے سوا کسی اور زبان میں دعا کرنا، وعظ کہنا اور دینی مسائل پر اظہار
خیال کرنا ایک نئی چیز تھی، اور لوگ اس پر معترض ہوتے تھے۔ ٹرکی میں جب پہلی مرتبہ جدید طرز پر
فوجوں کو مرتب کرنے اور نئے آلات جنگ کا استعمال رائج کرنے کی کوشش کی گئی تو ایک جماعت نے
اس پر سخت اعتراض کیا تھا۔ ان میں سے ہر موقع پر یہی کہا گیا کہ یہ بدعت اور احداث فی الدین ہے
مگر آج کوئی نہیں جس کو ان چیزوں پر اعتراض ہو۔ اعتراض تو درکنار آج عامی اور عالم سب ان کو
جائز بلکہ مستحسن سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ پر آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس قسم کے
اعتراضات دراصل غیر شرعی محرکات سے پیدا ہوتے ہیں، پھر ان کی تائید میں شریعت سے استدلال کرنے کی کوشش کی جاتی ہے
اسلام میں عربی زبان کی حیثیت کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس میں صحیح اور غلط دونوں کی آمیزش ہے۔ بالکل
درست ہے کہ اسلام سے عربی زبان کا خاص تعلق ہے۔ قرآن عربی میں نازل ہوا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے
اسوۂ حسنہ اور صحابۂ کرام کی سیرت کے متعلق تمام معلومات عربی میں ہیں۔ اسلام کا صحیح علم حاصل ہونا،
جس پر انسان کے مسلمان ہونے کا مدار ہے، عربی زبان کی واقفیت کے بغیر ممکن نہیں۔ امت مسلمہ کی وحدت
برقرار رکھنے کے لئے بھی عربی زبان ایک ضروری اور ناگزیر آلہ ہے۔ انہی وجوہ سے ہر زمانہ کے علماء نے
عربی کی تعلیم پر زور دیا ہے، اور انہی وجوہ سے آج بھی ہر صاحب عقل و فہم مسلمان یہ ضروری سمجھتا ہے
کہ مسلمانوں کی تعلیم میں عربی کو بحیثیت ایک ثانوی زبان کے لازمی طور پر شامل ہونا چاہیے۔ یہ تمام باتیں
بالکل برحق ہیں اور ان میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن جیسا کہ میں اس سے پہلے عرض کر چکا
ہوں "ہے" اور "چاہیے" میں بڑا فرق ہے۔ جو کچھ ہونا چاہیے اس کے لیے کوشش ضرور کیجیے، لیکن اگر
وہ عالم واقعہ میں نہیں ہے تو اپنے طرز عمل کو واقعات کے مطابق بنانے سے انکار نہ کر دیجیے۔ عقل اور
دین دونوں کا اقتضا یہ ہے کہ مقصد کو وسیلہ پر مقدم رکھا جائے۔ ایک وسیلہ اگر زیادہ بہتر ہے،

لیکن اب کارگر نہیں رہا تو دوسرا وسیلہ اختیار کیجیے جو کارگر ہو، اگرچہ بہتر نہ ہو لیکن اگر آپ وسیلہ پر اصرار کرکے اصل مقصد کو کھو دیں گے تو یہ نہ عقلمندی ہے نہ دینداری۔ اب آپ خود غور کیجیے کہ دین کا اصل مقصد کیا ہے؟ آیا یہ ہے کہ عربی زبان کو "سرکاری" اور قومی زبان کی حیثیت سے پھیلایا جائے؟ یا یہ کہ خدا کے بندوں کو اس کی تعلیم اور اس کے احکام سے واقف کرایا جائے؟ ظاہر ہے کہ اصل مقصد دوسری چیز ہے پس جب حال یہ ہے اور ہر شخص اس حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ غیر عربی ممالک میں دو فیصدی آدمی بھی عربی زبان سمجھنے والے باقی نہ رہے، اور ہم اس طاقت سے محروم ہو چکے ہیں جس سے صدر اول کے مسلمانوں نے عربی کے علم کو پھیلایا تھا، تو آپ کو سوچنا چاہیے کہ ہمارے لیے صحیح طریق کار کیا ہے؟ یہ کہ مقصد اصلی کو کسی دوسرے ممکن ذریعہ سے حاصل کریں؟ یا یہ کہ قدیم ذریعہ پر اصرار کرکے مقصد کو فوت ہونے دیں؟

آپ نے جن دلائل سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ "دین کی اشاعت ایک ہی زبان میں ہونی ضروری ہے"، وہ درحقیقت نہایت کمزور ہیں، اور اگر آپ زیادہ غور و فکر سے کام لیں گے تو ان کی کمزوری آپ پر خود ہی واضح ہو جائے گی۔ دین ایک عالمگیر حقیقت ہے۔ انسانی زبانوں میں سے کسی کے ساتھ اس کا مخصوص بالذات رشتہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اصل مقصد دین کو اپنے بندوں تک پہنچانا ہے، اور اس مقصد کے لیے جس طرح وہ ایک انسان کو وسیلہ بناتا ہے اسی طرح ایک زبان کو بھی وسیلہ بناتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اسی دین کو پہنچانے کے لیے وہ دوسری قوموں کے انسانوں اور دوسری قوموں کی زبانوں کو بھی وسیلہ بنا چکا ہے۔ پس اگر آخری تبلیغ کے موقع پر اس نے عربی قوم اور عربی زبان کو وسیلہ بنایا تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ اب صرف عربی زبان ہی سے اسلام کا رشتہ ہو گیا ہے اور دوسری زبانوں کو تبلیغ دین کے لیے استعمال کرنا ناجائز یا مکروہ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم صریح ہدایت فرما دیتے کہ عربی زبان کے سوا کسی زبان کو تبلیغ دین کے لیے

قیامت تک استعمال نہ کرتا۔ حالانکہ احادیث سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے بعض صحابہ کو غیر زبانیں سیکھنے کا حکم دیا تھا۔ اور عہد صحابہ میں حضرت سلمان فارسی جیسے غیر عربی الاصل حضرات عجمیوں کو ان کی اپنی زبانوں میں دین کی تعلیمات سمجھاتے تھے۔ رہی یہ بات کہ قیصر روم و شاہ ایران کو جو دعوت نامے بھیجے گئے تھے وہ عربی میں کیوں بھیجے گئے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی دارالترجمہ نہ تھا۔ صحابہ میں بہت کم لوگ ایسے تھے جو غیر زبانیں جانتے ہوں، اور جو لوگ جانتے تھے وہ بھی ان زبانوں کے ادیب نہ تھے کہ ایک نبیؐ کے شایان شان فصیح و بلیغ خط لکھ سکتے۔ نیز یہ بات حضور کو معلوم تھی کہ جن بادشاہوں کے نام آپ دعوت نامے لکھ رہے ہیں ان کو ایسے لوگ میسر آسکتے ہیں جو ان خطوط کا صحیح مفہوم انہیں سمجھا سکتے ہیں۔ پس حضور کا عربی میں اسلام کے دعوت نامے بھیجنا در اصل عملی زندگی کے موانع کا نتیجہ تھا، اور اسکی حیثیت بالکل ایسی ہی تھی جیسے پانی نہ ملنے کی صورت میں آپ نے تیمم کیا اور قیام کی طاقت نہ ہونے کی حالت میں بیٹھ کر نماز پڑھی۔ حالانکہ اگر اللہ چاہتا تو ہر جگہ آپ کے لیے ایک چشمہ پیدا کر سکتا تھا، اور آپؐ کو ہمیشہ بیماری اور ضعف سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔ ایسی مثالوں سے یہ نتیجہ نکالنا ہرگز درست نہیں کہ شریعت دین کی تبلیغ کو صرف عربی زبان تک محدود رکھنا چاہتی ہے، اور اس کا منشا یہ ہے کہ جو لوگ اس زبان سے واقف نہ ہوں ان کو ضلالت اور جہالت میں مبتلا رہنے دیا جائے۔

صحابۂ کرام اور ائمۂ متقدمین کی غیر زبانوں سے نفرت اور عربیت پر ان کے اصرار کے متعلق میں نے "تعصب" کا لفظ جو استعمال کیا تھا اس سے آپ غلط فہمی میں پڑ گئے۔ آپ نے یہ سمجھا کہ میں ان کی طرف "عصبیت جاہلیہ" کو منسوب کر رہا ہوں۔ حالانکہ میرا مقصد کچھ اور تھا۔ تعصب محض جاہلیت ہی کا نہیں ہوتا۔ ایک قسم کا تعصب وہ ہے جو ہر انسان کی فطرت میں ہوتا ہے اور جس کو عیب میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر ایک ہندوستانی جب چین جائیگا تو وہاں کی زبان، عادات، خصائل، طرز بود و ماند ہر چیز سے اجنبیت محسوس کرے گا۔ ان پر ناک بھوں چڑھائے گا۔ اور اس کو پسند نہ کرے گا کہ اس کے اہل و عیال

حیثیت اختیار کریں۔ یہ ایک فطری منافرت ہے جو ہر انسان کی طبیعت میں اجنبی چیزوں سے ہوتی ہے صحابۂ کرام بھی بہرحال انسان تھے اور عجمیت سے ان کی نفرت ایک حد تک اس بنا پر بھی تھی۔ اس میں مزید اضافہ اس وجہ سے ہو گیا کہ عجمی اقوام اس وقت سب کی سب کافر تھیں اور ان کے جو افراد مسلمان ہو جاتے تھے ان کو صحابۂ کرام عربیت کے رنگ میں رنگ لینا ضروری سمجھتے تھے تاکہ وہ کفار کی جمعیت سے الگ ہو کر اہلِ اسلام کی جمعیت میں جذب ہو جائیں۔ نیز صحابۂ کرام یہ بھی پسند نہ کرتے تھے کہ مسلمان (جو اس وقت تک تمام تر عرب ہی تھے) عجمی ممالک میں اہلِ عجم کی سی بولیاں بولنا اور ان کے سے لباس پہننا شروع کر دیں کیونکہ اس طرح کفار کی اکثریت میں ان کے جذب ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ پس صحابۂ کرام نے جو طرزِ عمل اختیار کیا اس کی بنیاد دو وجوہ پر تھی۔ ایک وجہ فطری تھی، اور دوسری وجہ حالات کے اقتضاء سے تعلق رکھتی تھی۔ ان میں سے پہلی وجہ کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتی اس لیے اس کو حجت بنانا درست نہیں۔ رہی دوسری وجہ تو اب وہ حالات باقی نہیں ہیں۔ اردو، فارسی، ترکی، جاوی، اور ایسی ہی دوسری زبانیں بھی عربی کی طرح اب مسلمانوں کی زبانیں ہیں، اور ان سے کسی اسلامی مصلحت کے تحت نفرت و اجتناب کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی ہے۔

کیا خطبۂ غیر عربیہ واجب ہے؟

مراد آباد سے ایک صاحب لکھتے ہیں:-

جناب نے خطبۂ غیر عربیہ کی نسبت جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ خطبۂ جمعہ غیر عربی میں دیا جانا صرف جائز ہے اور یہ کہ سامعین کی زبان میں دیا جا سکتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی درجہ میں ضروری نہیں ہے کیونکہ جواز کا اطلاق اولویت، عدم اولویت، اباحت، حتّٰی کہ کراہت پر بھی کیا جا سکتا ہے چنانچہ اسی کا باعث ہے کہ آخر میں جناب نے "جو عملی مشکلات" تحریر فرمائی ہیں اُن سے متاثر ہو کر اپنی رائے موجودہ طرزِ عمل کی پسندیدگی اور خطبہ غیر عربیہ کے عدمِ اجرا کی بہتری کے متعلق صاف طور پر ظاہر فرمائی ہے۔ حالانکہ اگر جناب کے نزدیک یہ کوئی ضروری چیز ہوتی تو ان احتمالی مضرتوں سے متاثر ہو کر ایسا کرنے کے بجائے ان کی اصلاح کے ذرائع پر زور دیا جاتا اور چاہے ان میں کامیابی متوقع ہوتی یا نہ ہوتی بہرحال خطبہ کو سامعین کی زبان میں دیا جانا ضروری قرار دیا جاتا اس لیے کہ کوئی واجب چیز کسی مصلحت یا مضرت سے متروک العمل نہیں ہو سکتی۔ البتہ وہ جائز چیز جو اولویت یا اباحت وغیرہ کے معنی میں ہو بعض مصالح و مضار کی بنا پر ترک ہو سکتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کے جو ذرائع ہوں ان کا اختیار کرنا بھی بجائے خود ضروری ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جب تک وہ ذرائع حاصل نہ ہوں ہم ایک واجب کو ترک کیے بیٹھے رہیں اور شارع نے جو ہمارے افادہ اور استفادہ کے لیے ہر ہفتہ ایک اجتماع کا موقع پیدا کیا تھا اس کو آئندہ کے لیے بھی ہم اسی طرح ضائع کرتے رہیں جس طرح کہ اب تک کرتے رہے۔

ظاہر ہے کہ خطبۂ جمعہ کم از کم واجب ضرور ہے اور یہ بھی آپ کو مسلم ہے کہ اس کا مقصد ذکر اللہ اور

رجوع الی اللہ کے ساتھ وعظ و تذکیر اور احکام دین کی تعلیم و تبلیغ بھی ہے پس جب خطبہ واجب تو اس کے مقاصد کی تحصیل بھی واجب۔ اور اظہر من الشمس ہے کہ اس کے مقاصد کا جزو اعظم بدون سامعین کی زبان اختیار کیے حاصل نہیں ہو سکتا تو بحکم مقدمۃ الواجب واجب اس کا اختیار کرنا بھی واجب ہوگا۔

پس واجب ہوا تو پھر کسی مصلحت اور مضرت کی وجہ سے اس کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں جن مضرتوں کا وقوع متوقع ہو ان کی اصلاح کے لیے سعی مستقل طور پر ضروری ہے۔

خطبہ غیر عربیہ کے اجرا میں جو سب سے بڑی مضرت آپ نے ظاہر فرمائی ہے وہ مسائل مختلف فیہ کا بیان اور ان کی وجہ سے نزاعات کا رونما ہونا ہے لیکن آپ نے اس کے اور نیز دوسرے مقاصد کے انسداد کی جو تدبیر بیان کی ہے میری رائے میں وہ بھی کافی نہیں ہے اس لیے کہ اول تو بقول آپ کے اس کی امید ہی کم ہے اور میرے نزدیک تو آجکل کے علماء کی طرف سے کسی ایسے کام کا انجام پا جانا گویا کہ خرق عادت ہے۔ تو ایسی حالت میں نہ تو نو من تیل ہوگا اور نہ رادھا ناچے گی پس نتیجہ معلوم کہ وہی تیلی کے بیل کی طرح جہاں تھے وہاں ہی رہیں گے؛

دوسرے یہ کہ فرض کیجیے کہ اہل علم کی کسی معتدل جماعت ہی کے تیار کردہ خطبے جاری کیے اور ان میں نزاعی مسائل سے کوئی تعرض بھی نہیں کیا گیا تاہم وہ خطیب جس کی زبان میں بقول آپ کے اللہ نے ایسا ڈنک رکھدیا ہے جس سے دلوں کو زخمی کیے بغیر وہ کوئی بات نہیں کر سکتا اور جو اپنے مشرب میں اتنا سخت ہے کہ دوسرے مشرب والوں کے ساتھ وہ کوئی رعایت نہیں کر سکتا، وہ اس معتدل جماعت ہی کے تیار کردہ خطبے پڑھنے کے باوجود اپنے مشرب کی تبلیغ اور اس کے خلاف سے تعرض کیے بغیر کیسے رہ سکے گا؟ اول تو کسی مقرر کے نزدیک یہ امر کچھ مشکل نہیں ہے کہ اپنی تقریر کا رخ جدھر چاہے پھیر دے۔ پھر خصوصیت سے مولوی مقرر کو تو ایسا کر لینا بہت ہی سہل ہے، مولوی اپنے مشرب کی تبلیغ کرتا ہے تو قرآن اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے، دوسروں کی تردید کرتا ہے تو قرآن

اس کی زبان پر ہوتا ہے، کسی کی مدح کرتا ہے تو قرآن سے اس کا استدلال ہوتا ہے، کسی کو گالیاں دیتا ہے تو قرآن ہی سے اس کا استناد ہوتا ہے، غرض وہ اپنے ہر اس قول وفعل کو جس پر اُس کو کسی نہ کسی حد تک اصرار ہے یا کسی وجہ سے اس کو پسند ہے قرآن ہی کی آیات تلاوت کرکے لوگوں کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہے، چاہے فی الحقیقت اس کا وہ مسلک شریعت حقہ کی روشنی میں بالکل ہی باطل محض ہو۔ پس ایسی حالت میں وہ کونسی قوت ہے جو اس کو روک سکے؟

اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جاوے کہ وہ خطیب صرف انہیں مرتب شدہ خطبوں کے مضامین میں اپنی تقریر کو منحصر رکھے اور اس کے علاوہ کسی مضمون پر زبان نہ کھولے تو یہ چیز ایک حد تک پھر خطبہ کے اصل مقصد کو فوت کر دیگی اس لیے کہ اس کے مقاصد میں یہ بھی داخل ہے کہ خطیب حسب ضرورت زمان ومکان کی حالت کے مناسب خطبہ دے ورنہ دق کے مریض کو ہیضہ کا علاج بتلانے کے مرادف ہوگا۔ اور اس صورت مذکورہ میں وہ اگر بالکل نہیں تو من وجہ موجودہ صورت مروجہ کے مشابہ ضرور ہو جائیگا فرق صرف تبدیل لسان کا ہوگا اور مضامین میں وہی تعیین وتقیید رہے گی جواب ہے اور متعدد مضامین کے خطبوں کا بھی اس غرض سے ہونا کہ انہیں سے جو مناسب ہو پڑھ لیا جایا کرے کافی نہ ہوگا کیونکہ ہر جگہ اور ہر وقت کی بعض ضرورتیں مخصوص ہوتی ہیں جو ان مضامین میں نہیں آسکتیں جو عمومی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے مرتب کیے گئے ہوں۔

اور اگر ان تمام امور سے بھی نظر کو منقطع کر لیا جاوے تو ان خطبوں میں کم از کم علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین الخ مَن احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو رد، وایاکم ومحدثات الامور، کل بدعۃ ضلالۃ۔ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول اِنَّ اللّٰہَ لَایَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ الخ۔ یا اسی قسم کے دوسرے الفاظ اور مضامین تو ضرور ہی ہوں گے۔ کم از کم کلمۂ شہادت ہونا اور اس میں اَشْھَدُ اَنْ

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۔ کا پڑھا جانا تو بالکل یقینی امر ہے۔ پس اس نیش زن مولوی کو تو یہی بہت ہے اگر وہ اپنی سرشت کے مطابق چاہیگا تو اسی کے ضمن میں سب کچھ کہہ سکتا ہے، اپنے مشرب کے اعتبار سے ردًا و قبولًا ہر حیثیت سے اس میں گفتگو کو طویل کر سکتا ہے۔

پھر یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ اختلافی مسائل سے مطلقًا روک دینا کیوں ضروری قرار دیا گیا؟ اس میں جو مضرت بیان کیگئی ہے اس کے ممکن الوقوع ہونے سے انکار نہیں ہے لیکن کیا محض ایک محتمل خیر کی خاطر یقینی مضرت اختیار کی جا سکتی ہے؟

یہ ضرور ہے کہ جب تک کوئی خاص ضرورت اور مقامی حیثیت سے ان مسائل کو بیان کرنے کی وقتی مصلحت پیش نہ آوے، بلا وجہ ان مسائل پر لب کشائی نہ کی جائے لیکن جب ضرورت داعی ہو تو پھر ان کی تبلیغ بھی ایسی ہی ضروری ہونی چاہیے جیسی دوسری اصلاحات کی۔

ظاہر ہے کہ فی زماننا جو زیادہ فسادات اور نزاعات رونما ہوتے ہیں وہ اکثر شرک و بدعت کی مذمت اور ان کی جزئیات کی تفصیل سے واقع ہوتے ہیں اور یہ موضوع مسلمانوں کی اصلاح کے لیے ایسا ضروری ہے کہ بہر حال ناگزیر ہے اور کسی وقت کسی حال میں اس سے تغافل نہیں کیا جا سکتا۔ اگر خطبہ میں اصلاح عقائد، توحید و رسالت کا اصل مفہوم، اعتصام بالسنۃ، اجتناب عن البدعت، شرک کی مذمت اور اس کے اقسام کی تفصیل ہی سے سامعین کو خبردار نہ کیا گیا تو میں نہیں سمجھتا کہ ان مضامین سے زیادہ کونسا وہ موضوع ہے جو مسلمانوں کے دین کی اصلاح سے متعلق ہوں،

پس میری رائے میں صرف یہی طریقہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ کا وہ حصہ جو تبلیغ احکام سے متعلق ہو لازمًا بہر حال زبان سامعین میں ہونا ضروری ہے اور جن مضرتوں کے پیدا ہونے کا امکان ہے۔ ان کا انسداد دوسرے خارجی ذرائع سے کیا جائے مثلًا یہ کہ خطباء کو بذریعہ تحریر و تقریر سمجھا دیا جاوے کہ وہ بلا ضرورت ان مسائل کی تفصیل میں نہ پڑا کریں اور جب ضرورت ہو تو بیشک بیان کریں

مگر طرز بیان تشدد آمیز اور ڈنک مارنے والا نہ ہو۔ صاف اور سیدھے طریقہ سے نرم الفاظ میں مسلک حق کو واضح کیا کریں۔ ذاتیات کے حملوں سے بچتے رہیں۔

آخر اب بھی تو اس قسم کے مولویوں کی تقریروں سے نزاعات ہوتے ہی ہیں اُن کو روکنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں اُنپر یہاں بھی عمل کیا جا سکتا ہے۔

پھر قابل لحاظ یہ امر بھی ہے کہ اب تو اس قسم کے اختلافات کا اثر عوام پر اس درجہ گہرا ہو چکا ہے کہ اکثر و بیشتر ایک عقیدہ اور خیال کا آدمی دوسرے عقیدہ اور خیال والے کی اقتداء ہی نہیں کرتا اور ہر عقیدہ و خیال کے لوگوں کی نماز جماعت عموماً اور نماز جمعہ خصوصاً الگ الگ ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کی اقتدار سے محترز ہے مسجدیں سب کی الگ الگ باعتبار اکثریت کے بنی ہوئی ہیں، پس اپنے اپنے ہم خیال لوگوں اور اپنی اپنی مسجدوں میں جیسی چاہیں تقریر کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ کوئی مانع نہیں ہو سکتا اور اکثر نہیں ہوتا۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے صرف ان دو فرقوں کو ذہن میں لے کر عرض کیا گیا ہے جو عوام کی زبان میں دیوبندی اور بریلوی وہابی اور بدعتی کے ناموں سے مشہور ہیں اس لیے کہ ہندوستان میں انھیں دونوں کی کثرت ہے اور واقعات کے اعتبار سے بھی جہاں جہاں فسادات ہوتے ہیں غالباً ان دونوں کے علاوہ اور فرقوں میں نہیں ہوتے یا مجھکو معلوم نہیں لیکن اگر ہوتے ہوں گے تو بہت ہی کم۔ بہرحال اکثریت کے لحاظ سے یہی دونوں زیادہ قابل لحاظ معلوم ہوئے۔ اور جب اکثریت کے بارے میں میری یہ رائے ہے تو اقلیتوں کے متعلق تو بدرجہ اولیٰ سمجھنی چاہیے۔

رہا موضوعات اور بے اصل قصص کے بیان کا خطرہ تو وہ اس طرح رفع ہو سکتا ہے کہ ہر جگہ کے با اثر لوگ اس امر کا خاص اہتمام کریں کہ امامت جمعہ کے لیے جاہل اور پیشہ ور واعظوں کو ہرگز منتخب نہ کریں حتی الامکان مستند اور ذی فہم علماء کے سپرد یہ کام کیا جائے یا اگر وہ عالم مستند نہ ہو تو مشاہیر

علماء میں سے کوئی صاحب اس کو قابل اعتماد اور اس کے بیان کو قابل سماعت تجویز کر دیں۔

پھر علماء کی طرف سے کوئی ایسا رسالہ ان تمام ائمہ کے لیے تالیف کر کے شائع کر دیا جائے جس میں واضح طور پر ان مفاسد سے بچنے کے اصول تبلا دئے گئے ہوں۔ مثلاً یہ کہ کوئی روایت حدیثی یا قصہ تاریخی بدون کامل تحقیق کے نہ بیان کیا کریں یا یہ کہ فلاں کتاب فلاں ابواب میں فلاں فلاں شرائط سے اس قابل ہے کہ اس کی روایات کو بیان کیا جا سکتا ہے۔ اور فلاں فلاں کتاب ایسی ہے کہ اس سے غیر محقق کو بالکلیہ اجتناب کرنا چاہیے۔ غرض یہ یا اور جو مفید امور ہوں اس رسالہ کے ذریعہ ان سے ان ائمہ جمعہ کو آگاہ کر دیا جائے۔ میری رائے میں اس طرح کرنے سے اس مفسدہ کا غالباً بہت بڑا انسداد ہو سکیگا۔

هذا ما عندی والعلم عند الله العليم الخبير

ترجمان القرآن۔ یہ ایک عجیب صورت حال ہے۔ ایک جماعت عجمی زبان کے خطبہ کو مکروہ تحریمی ثابت کرتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کا فاعل گنہگار ہو۔ دوسری جماعت اسی چیز کو واجب ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا تارک گنہگار ہو۔ چیز ایک ہی ہے، مگر اس پر دو بالکل متضاد حکم لگائے جاتے ہیں۔ حالانکہ خدا کی شریعت جن اصولوں پر قائم ہے ان میں کامل یکسانیت ہے، اور ان کی یکسانیت کا اقتضا یہ ہے کہ ہر چیز کے متعلق حکم ایک ہی ہو۔ اس قسم کے متضاد احکام کو دیکھ کر بیچارے ناواقف عوام سخت حیرانی میں پڑ جاتے ہیں کہ آخر ہم کیا کریں۔ ایک کام کرتے ہیں تو گناہ گار، نہیں کرتے تو گناہ گار۔ کسی کو شبہ ہونے لگتا ہے کہ شائد اس شریعت ہی میں کوئی نقص ہے جس کی بنا پر ایسے متضاد احکام اخذ کیے جاتے ہیں یا کیے جا سکتے ہیں۔ کوئی علماء سے بدگمان ہو جاتا ہے اور انہیں چھوڑ کر خود اپنی ناقص عقل اور ناقص علم سے احکام کی الٹی سیدھی تعبیریں کرنے لگتا ہے۔ کسی کو علوم دینیہ کے متعلق شکوک پیدا ہوتے ہیں اور وہ ان وسائل ہی کی جڑ پر کلہاڑی مارنے لگتا ہے جو در حقیقت احکام شرع معلوم کرنے کے لیے ناگزیر ہیں۔ آجکل جو نئے نئے فتنے مسلمانوں میں پیدا ہو رہے ہیں ان کی ایک بڑی وجہ یہی ہے۔ افسوس ہے کہ وہ لوگ جو مذہبی معاملات میں

مسلمانوں کے رہنما ہیں۔ ان کو اب تک اس امر کا احساس نہیں ہوا کہ یہ خرابیاں ان کے کس طرز عمل سے پیدا ہو رہی ہیں، اور خود ان کے طرز عمل میں کیا خرابی ہے۔

اصل یہ ہے کہ جن امور کو شارع نے صریح طور پر فرض یا واجب یا حرام یا ناجائز ٹھیرا دیا ہے صرف وہی ان اصطلاحوں سے موسوم کیے جا سکتے ہیں، اور انہی کے فعل یا ترک پر گناہ یا ثواب کا حکم لگایا جاتا ہے۔ باقی رہے وہ امور جو ہم اپنے قیاس واستدلال کے ذریعہ سے شارع کے قول یا عمل سے مستنبط کرتے ہیں، تو ان کو فرض یا واجب قرار دینا، یا حرام یا ناجائز ٹھیرانا اور ان کی بنا پر ثواب یا عقاب کا حکم لگانا اصلاً غلط ہے، اس لیے کہ انسان کو انسان پر کوئی چیز فرض وواجب کرنے یا حرام وناجائز ٹھیرانے کا قطعاً کوئی حق نہیں ہے اور عذاب وثواب خدا کے اختیار میں ہیں نہ کہ انسان کے اختیار میں وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ (النحل: ۱۱۶) ایک بڑے سے بڑا عالم اور امام جلیل القدر بھی زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہنے کا حق رکھتا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ میں کتاب اللہ وسنت رسول اللہ سے ایسا سمجھتا ہوں، میرے نزدیک فلاں بات کی جا سکتی ہے یا اس کا کرنا اولیٰ ہے یا فلاں بات نہیں کی جا سکتی یا اس کا کرنا درست نہیں۔ اگرچہ رائے کا اختلاف اس صورت میں بھی باقی رہتا ہے، اس لیے کہ ایک شخص کا فہم دوسرے شخص کے فہم سے بالکل مطابق تو نہیں ہو سکتا، لیکن یہ اختلاف احکام شریعت میں نہیں بلکہ انسانی اجتہاد میں ہوگا اور اس کی بنا پر وہ فرقے نہ بن سکیں گے جو اجتہادی اختلافات کی وجہ سے ایک دوسرے کو گنہگار اور گمراہ ٹھیراتے ہیں، اور إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا کے مصداق بن گئے ہیں۔

اس اصل کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ اس کے بعد زبان خطبہ کے مسئلہ پر غور کیجیے۔ شارع نے کہیں یہ تصریح نہیں فرمائی کہ خطبہ فلاں زبان میں دینا واجب ہے یا فلاں زبان میں دینا مکروہ تحریمی ہے۔ اسی طرح شارع نے

ان مقاصد کی تفصیل بھی بیان نہیں کی جن کے لیے خطبہ کو نماز جمعہ کے ساتھ لازم کیا گیا ہے۔ اس باب میں جتنی مختلف باتیں مختلف خیالات کے اہل علم بیان کرتے ہیں وہ شارع کے کسی صریح حکم پر مبنی نہیں ہیں، بلکہ انہوں نے صاحب شریعت کے عمل کو دیکھ کر اپنی فہم کے مطابق مختلف امور اخذ کیے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک گروہ کا فہم صحیح ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ دوسرے گروہ کا فہم صحیح ہو۔ دونوں کو اپنے اپنے دلائل پیش کرنے کا حق ہے لیکن کسی کو یہ حق نہیں کہ اپنے فہم سے جو حکم وہ نکال رہا ہے اسے واجب ٹھیرائے اور اس کے تارک کو گناہ گار قرار دے۔ لوگوں کو پوری آزادی حاصل ہے کہ جس کے دلائل کو وہ زیادہ وزنی سمجھیں اور جس کی رائے پر ان کو اطمینان ہو جائے اس کا اتباع کرلیں۔ شارع کا تصریح نہ کرنا خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس نے لوگوں کو اس باب میں آزادی بخشی ہے۔ اگر اس میں لوگوں کے طریقے مختلف ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں جس کا مسلک زیادہ قوی دلائل پر مبنی ہوگا، اور جس کی رائے مسلمانوں کے اجتماعی ضمیر کو زیادہ مطمئن کرنے والی ہوگی اسی کے اتباع پر بالآخر سواد اعظم مجتمع ہو جائے گا۔ اور اختلاف عمل کا دائرہ خود بخود گھٹتا چلا جائے گا۔

خطبۂ غیر عربیہ کو واجب قرار دینے کے لیے جو طریق استدلال ہمارے مراسلہ نگار نے اختیار کیا ہے وہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی یوں کہے کہ نماز کے مقاصد میں سے اہم ترین مقصد رجوع الی اللہ ہے اور رجوع الی اللہ بغیر خشوع و خضوع کے ممکن نہیں۔ اور جس چیز پر فرض کے مقصد کا حصول موقوف ہو وہ بھی فرض ہونی چاہیے، لہذا خشوع و خضوع بھی نماز ہی کی طرح فرض ہے یہ طرز استدلال ممکن ہے کہ منطق کی رو سے درست ہو مگر شرع کی رو سے درست نہیں۔ اس لیے کہ یہ شخص امت پر ایسی چیز فرض کرتا ہے جسے خدا نے فرض نہیں کیا۔ شریعت میں صرف وہی چیز فرض یا حرام ہے جس کو خدا نے فرض یا حرام قرار دیا ہے ہم کو منطقی استدلال سے فرائض اور حرمات کی فہرست میں اضافہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔ پچھلی امتوں نے یہی غلط طریقہ اختیار کر کے اپنے اوپر وہ بہت سی چیزیں لازم کرلی تھیں جو خدا نے ان کے اوپر لازم نہیں کی تھیں اور

یہی وہ بوجھ اور پھندے تھے جن سے انسانیت کو آزاد کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھیجے گئے وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (الاعراف : ۱۹)

پس زبان خطبہ کے متعلق جو رائے میں نے ظاہر کی ہے، اور اس کے خلاف جو رائے بعض علماء کرام ظاہر فرماتے ہیں، ان میں سے کسی کو بھی یہ حیثیت حاصل نہیں ہے کہ لوگوں پر اس کا ماننا واجب ہو اور اس کی خلاف ورزی کرنے سے ان پر کوئی گناہ لازم آتا ہو۔ اگر کوئی شخص مفتیانہ تحکم کے انداز میں اپنی رائے بیان کرتا ہے تو یہ اسکی غلطی ہے۔

میں نے زبان خطبہ کو بدلنے سے پہلے جن امور کی اصلاح کو ضروری قرار دیا ہے ان پر صاحب مراسلہ نے پوری طرح غور نہیں فرمایا اسی بنا پر وہ شبہات پیدا ہوئے جو انہوں نے بیان کیے ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ شرعی نظام کے درہم برہم ہو جانے کی وجہ سے اسلام کا کوئی حکم اپنی اصل پر باقی نہیں رہا ہے جمعہ اور خطبہ ہمارے شرعی نظام کے اہم ترین اجزاء میں سے تھے۔ ایک عظیم الشان اجتماعی مقصد تھا جس کی تحصیل کے لیے دوسرے اجزاء کے ساتھ ان دونوں چیزوں کو بھی خاص حکیمانہ تناسب سے ایک نظام میں نصب کیا گیا تھا۔ اب وہ نظام ٹوٹ گیا، اجزاء پراگندہ ہو گئے، ان کا باہمی ربط اور اجتماعی زندگی کے ساتھ ان سب کا مجموعی ربط ٹوٹ گیا، اور سرے سے وہ عظیم الشان مقصد ہی اب دلوں سے محو ہوتا جا رہا ہے جس کے لیے تمام اجزاء فراہم کیے گئے تھے! اس حالت کی صحیح اصلاح تو اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ وہ شرعی نظام پھر سے قائم کیا جائے اور اس کے بکھرے ہوئے اجزاء کو پھر اسی طرح جمع کر کے ایک مشین کے پرزوں کی طرح نصب کر دیا جائے تاکہ اس کی حرکت کے ساتھ ہی وہ نتائج برآمد ہونے شروع ہو جائیں جو اس سے مطلوب ہیں۔ تاہم اگر یہ نہیں ہو سکتا تو کم از کم اتنا ہی ہو کہ مسلمانوں میں ایک رائے عام پیدا کی جائے، بڑے پیمانہ پر نہیں تو چھوٹے پیمانے پر ہی ان کو اپنے اجتماعی کام ایک نظم کے ساتھ انجام دینے کی عادت ڈالی جائے، اور رائے عام کی طاقت سے ان مضرتوں کا سد باب کیا جائے جو غیر ذمہ دار لوگوں کی منتشر حرکات سے پیدا ہوتی ہیں

لیکن اگر یہ بھی نہیں ہو سکتا تو پھر اصلاح کا نام نہ لیجیے، اور جو کچھ ہو رہا ہے اس کو اسی طرح ہونے دیجیے، کیونکہ ہر شخص اپنے ذہن میں اصلاح کا جو مفہوم سمجھے بیٹھا ہے، اگر وہ اسی کے مطابق انفرادی طور پر عمل شروع کر دے تو بے شمار مصلحین، ایک دوسرے کے خلاف عمل کرنے والے پیدا ہو جائیں گے اور ان کی کارگزاری کا نتیجہ صلاح کے بجائے مزید فساد ہوگا۔

نظام شرعی میں خطیب جمعہ کی حیثیت محض ایک واعظ کی نہیں ہے بلکہ وہ ایک ذمہ دار شخص کی حیثیت رکھتا ہے جس پر اپنے حلقہ کی جماعتِ مسلمین کی نگرانی کرنے اور ان کی اجتماعی زندگی کو مفاسد سے بچانے اور ان سب کو عام قومی پالیسی کے مطابق چلانے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ذمہ داری بجائے خود ایک معلم ہے جس شخص پر اس کا بار پڑتا ہے، وہ خود ذمہ داری ہی سے سیکھ لیتا ہے کہ اس سے کیونکر عہدہ برا ہو۔ بخلاف اس کے ایک غیر ذمہ دار شخص جو نہ کسی نظام جماعت سے تعلق رکھتا ہو، نہ کسی کے سامنے جواب دہ ہو، نہ اس امر کا کوئی تصور رکھتا ہو کہ اس کا خطبہ جماعت کی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے بلکہ اثر انداز ہوتا بھی ہے یا نہیں، ایسا شخص خطبۂ جمعہ کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ جماعت کی فلاح و بہبود کن چیزوں کی مقتضی ہے؟ کون سے مفاسد ہیں جن کی اصلاح اس کو پہلے کرنی چاہیے؟ کن تعلیمات کی تلقین اور کن احکام کی تبلیغ مقدم ہے اور اس کام کو کس طرح انجام دیا جائے کہ فائدۂ مطلوب حاصل ہو؟ ہمارے جمعوں کے امام چونکہ کوئی ذمہ دارانہ حیثیت ہی نہیں رکھتے اس لیے درحقیقت وہ خطیب کے ان فرائض کو ادا کرنے کے ناقابل ہیں۔ وہ اگر عالم بھی ہوں تو ان کی حیثیت ایک واعظ اور مبلغ کی ہوگی، وہ محض اپنے شخصی اختیار تمیزی کی بنا پر تعلیم و تبلیغ کریں گے اور اس سے کوئی خاص اجتماعی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ بلکہ اس کے برعکس ان کے غیر ذمہ دارانہ مواعظ سے یہ تھوڑی بہت اجتماعیت بھی جو اب حاصل ہوتی ہے، پراگندہ ہو جائے گی۔

اگر نظام شرعی کا احیاء اس وقت ممکن نہیں ہے، جیسا کہ بظاہر نظر آرہا ہے، تو آخری صورت وہی ہے

جو میں نے بیان کی ہے۔ اہل علم کی ایک جماعت، جو کسی حد تک ذمہ دارانہ حیثیت رکھتی ہو، خطبات جمعہ مرتب کرنے کے لیے مقرر ہونی چاہیے، اور اس کو ایسے خطبات مرتب کرنے چاہئیں جن میں اصول اسلام کو غیر اختلافی طریقوں سے بیان کیا جائے، مسلمانوں میں وحدتِ قومی کا احساس پیدا کیا جائے، ان کو عام اخلاقی مفاسد اور خلاف شریعت اعمال پر (جو متفق علیہ ہیں) متنبہ کیا جائے، اور ایسے احکام بیان کیے جائیں جن سے مسلمانوں کے کسی فرقہ کو بھی اختلاف نہیں ہے۔ اجتماع جمعہ کے مقاصد کی تحصیل کا کم سے کم ذریعہ یہی ہے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ مختلف فرقوں کے جمعے جو الگ الگ ہونے لگے ہیں، ان کو بند کیا جائے اور ایسی صورتیں پیدا کی جائیں کہ کم از کم جمعہ میں تمام یا اکثر فرقوں کے مسلمان ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں جمعوں کا الگ ہونا غایت درجہ نقصان دہ چیز ہے۔ اس کو مٹانے کی ضرورت ہے۔ نہ یہ کہ ایسے اسباب پیدا کیے جائیں جن سے یہ بیماری اور زیادہ ترقی کرے۔ واعظوں کو اگر اپنے نقطۂ نظر کے مطابق وعظ کہنا ہے اور وہ اپنے مسلک کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں تو وہ مسجدوں سے باہر جہاں چاہیں لب کشائی کریں۔ مسجدیں جمع کرنے کے لیے بنائی گئی ہیں، نہ کہ تفریق کرنے کے لیے۔ ان کو مساجد ضرار بنانا ایک بدترین فعل ہے جسے کسی حال میں گوارا نہیں کیا جاسکتا۔